تذکرۂ اسلاف

پروفیسر طاہر محمود

(۱)

برّ اعظم یورپ کے قدیمی جزیرۂ انگلستان کے باشندے سترھویں صدی عیسوی میں تجارت کی غرض سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے مگر پھر ہوس ملک گیری میں آہستہ آہستہ اس عظیم الشان ملک کے جابر وظالم حاکم بن بیٹھے تھے۔ بنگال سے شروع کر کے انھوں نے بتدریج آگے بڑھتے ہوئے بالآخر پورے ملک پر قبضہ کرلیا تھا۔ مشرقی ہندوستان میں انھوں نے تاج محل کی عالمگیر شہرت کے باعث پہلے آگرہ شہر اور اسکے قرب وجوار پر قبضہ کیا اور پھر تہذیب وثقافت کے مشہور عالم مرکز اودھ کا علاقہ بھی ہتھیا لیا۔ آگے چل کر انھوں نے ملک کے ان دونوں علاقوں کو ملا کر ایک صوبہ بنایا اور اسے یونائیٹڈ پراونسز آف آگرہ اینڈ اودھ (ممالک متحدہ آگرہ واودھ) کا نام دیا جو اپنے انگریزی نام کے مخفف ''یوپی'' کے لفظ سے مشہور ہوگیا۔ آزادی کے بعد صوبے کے اس مختصر نام کو باقی رکھنے کی غرض سے اسے ''اتر پردیش'' کہا گیا۔ ہمارے اسلاف پدری کا تعلق اسی صوبہ اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی کے مردم خیز قصبوں جائس اور نصیر آباد سے تھا۔ اس خاندان کے جدّ امجد کا اسم گرامی سیّد خان عالم تھا جو کہ تاریخی حساب سے مغل شہنشاہ نصیر الدین محمد ہمایوں کے دور حکومت میں وقت کی معروف ادبی شخصیت ملک محمّد جائسی کے ہمعصر رہے ہوں گے۔ حضرت خان عالم علیہ الرحمۃ کی کی اگلی چار پشتوں کے بزرگوں کے اسمائے گرامی جو خاندانی شجرے میں مذکور ہیں سیّد بدر جہاں، سیّد شیر محمّد، سیّد محمّد حسن اور سیّد فضل حسن تھے مگر انکے کوائف حیات کا ہمیں علم نہیں ہے۔ یہ سب لوگ اہل سنّت والجماعت کے حنفی مسلک کے پیرو تھے۔ رضی الله علیهم اجمعین۔

سیّد خان عالم علیہ الرحمۃ کی پانچویں پشت میں مخدوم ما سیّد ہادی حسن مرحوم ومغفور ہمارے پردادا تھے جو انّیسویں صدی کے اواخر میں قصبہ جائس سے بہ سلسلۂ ملازمت ہجرت کر کے ہندو نیپال کی سرحد پر واقع اودھ کے قدیم شہر بہرائچ میں آبسے تھے جو کسی زمانے میں اس علاقے کا مرکزی شہر تھا، اور اس طرح یہ تاریخی شہر جس کی زمین کے نیچے نہ جانے کتنے اولیاء کرام ابدی نیند سو رہے ہیں اور جس نے جانے کیسے کیسے مہہ پاروں کو جنم دیا ہے ہمارا پدری وطن بن گیا تھا۔ یہ مشرقی ہندوستان کا وہ قدیم خطّہ ہے جسکا ذکر خیر تاریخ کی کتابوں میں بھی ہے اور اردو کے قدیم شعراء کے کلام میں بھی۔ اس شہر میں تاریخ کی معروف دینی شخصیت سیّد سالار مسعود غازی کا مدفن ہے جس سے اسے عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ پردادا حضور وہاں ریاست کپورتھلہ کے تنظیمی عملے میں صدر منصرم کے عہدے پر فائز تھے اور ایک دینی اور علمی شخصیت کی حیثیت سے انکی شہر اور اسکے مضافات میں بڑی عزّت تھی۔ ۱۹۱۸ء میں جہان فانی سے رخصت ہو کر شہر کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے سامنے نمائش گراؤنڈ کے ایک گوشے میں مدفون ہوئے۔ اس اسکول میں ہماری ابتدائی تعلیم کے زمانے میں انکی آخری آرامگاہ محفوظ تھی اور ہمیں اسکی کئی بار زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔

پردادا حضور کے خلف اکبر مخدوم بندہ سید احمد حسن مرحوم ومغفور ہمارے دادا تھے جو شہر کے ایک معروف ومقبول طبیب بھی تھے اور ایک جید عالم دین اور حافظ قرآن بھی۔ وہ اور انکے اہل خانہ بہرائچ شہر کے محلّہ قاضی پورہ میں ایک پرانی وضع کے مکان میں رہتے تھے جسکے باہری حصّے میں انکا مطب تھا۔ ہر آنے جانے والے کو عربی زبان جس پر انھیں عبور کاملہ حاصل تھا سیکھنے کی ترغیب دیتے تھے اور فرصت کے اوقات میں خود سکھاتے بھی تھے۔ شہر کی جامع مسجد قریب ہی واقع تھی مگر انھوں نے مسجد فاطمہ نام کی ایک چھوٹی سی قریبی مسجد کو اپنی کفالت میں لے رکھا تھا اور وہاں نماز پنجگانہ اور جمعے کا اہتمام کرتے تھے۔ اکثر وبیشتر خود امامت فرماتے اور ایک سال رمضان المبارک میں پورے قرآن کے ساتھ تراویح کی نماز بھی پڑھائی تھی جس کا ذکر ''حکیم سید احمد حسن نے محراب سنایا'' کے الفاظ سے مع دن تاریخ مسجد میں رکھے ہوئے کلام پاک کے ایک نسخے پر لکھا ہوا ہم نے بچپن میں بصد احترام وعقیدت دیکھا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۴ء کو انتقال فرمایا اور اسٹیشن روڈ پر واقع حضرت شاہ بڈھن کے مقبرے کے پاس مدفون ہوئے۔ ہم اس وقت اوائل طفلی میں تھے مگر گھر کے صحن میں تخت پر نماز پڑھتے ہوئے انکی سفید براق کپڑوں میں ملبوس فرشتہ صورت شبیہ جانے کیسے ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں اب تک محفوظ ہے۔ دادا حضور کی شادی ضلع رائے بریلی کے قصبہ نصیر آباد کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی اور دادی صاحبہ نے مارچ ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا تھا۔

دادا حضور کو خدا نے چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے عطا کئے تھے۔ دونوں بڑے بیٹے سیّد مصطفیٰ حسن اور سیّد مرتضیٰ حسن مرحومین (جنھیں ہم بالترتیب تایا ابّا اور ابّا جی کہتے تھے) صوبائی حکومت کی ملازمت میں تھے اور اس سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ تایا ابّا کی شریک حیات محترمہ اشتیاق النساء ۱۹۴۷ء میں میلاد شریف کے ایک جلسے میں شرکت کے دوران اچانک انتقال کر گئی تھیں۔ ان لوگوں کی واحد اولاد سید ذکی حسن انیس نے علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد تایا ابّا بہرائچ میں مقیم رہے اور ثقل سماعت کے باوجود بڑی محنت سے کلام پاک حفظ کیا۔ وہ ہمارے گھر سے متصل اپنے گھر میں تنہا رہتے تھے اس لئے ہم انکی ہمہ وقت خدمت کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۶ء میں ضلع جونپور کی تحصیل کراکت میں ابّا جی کے گھر پر انتقال کیا۔ مشیّت ایزدی سے ہم اتفاقاً ان کے انتقال کے دن ہی کراکت پہونچے تھے، جنازہ قبرستان جا چکا تھا اور ہم نے بھاگم بھاگ وہاں جا کر تدفین میں شرکت کی تھی۔ ابّا جی کی اہلیہ محترمہ عائشہ خاتون کا آبائی تعلق فتح پور ہنسوا سے تھا۔ انکی اولاد میں تین بیٹیاں (عطیہ، رئیسہ، نفیسہ) اور پانچ بیٹے (رئیس، نفیس، شمیم، شمسی، نجمی) تھے۔ ان میں سے نفیسہ پاکستان میں مقیم ہیں اور نجمی دہلی میں، باقی دنیا میں نہیں ہیں۔ عطیہ خاتون کی شادی تایا ابّا کے بیٹے سید ذکی حسن انیس سے ہوئی تھی۔ رٹائرمنٹ کے بعد ابّا جی گونڈے میں اقامت پذیر ہوئے، الٰہ آباد میں مولانا تھانوی کے خلیفہ شاہ وصی اللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں گونڈے میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔

دادا حضور کے تیسرے بیٹے سید محمود حسن صاحب کا ذکر ہم تفصیل سے ذیل میں کریں گے۔ چوتھے بیٹے سید مسعود حسن پیشۂ زراعت سے منسلک تھے۔ انکی شادی ابّا جی کی اہلیہ محترمہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی جسکے کچھ عرصہ بعد ہی وہ عین عالم شباب میں کسی دشمن کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے سیّد سعید حسن بھی سرکاری ملازمت میں تھے۔ سبکدوشی کے بعد وہ ضلع فیض آباد کی تحصیل اکبر پور میں رہائش پذیر تھے۔ رائے بریلی کے ایک سفر کے دوران اچانک انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ انکی شادی فیض آباد کی خدیجہ خاتون سے ہوئی تھی اور ایک بیٹی (شمع) اور چار بیٹے (اعجاز سعید، اقبال، کمال اور جمال) ہوئے تھے۔ انکی وفات کے بعد شمع کی شادی ابّا جی کے تیسرے بیٹے شمیم سے ہوئی تھی۔ دادا حضور کی بڑی بیٹی امّ سلمیٰ خاتون جو باجی کہلاتی تھیں لاولد تھیں، اور منجھلی سلیمہ خاتون اپنے اہل خانہ کے ساتھ فیض آباد میں رہتی تھیں۔ دونوں چھوٹی بیٹیاں حمیدہ خاتون اور سعیدہ خاتون الٰہ آباد میں دائرہ شاہ اجمل کے ایک دینی خانوادے میں دو حقیقی بھائیوں سے منسوب تھیں۔ چھوٹی لکھنؤ میں اپنے شوہر ابوالحسن عثمانی کے ساتھ رہتی تھیں جو سرکاری ملازمت میں تھے اور سبکدوشی کے بعد بہرائچ کی درگاہ سید سالار مسعود غازی کے مہتمم مقرر ہوئے تھے۔ بڑی کے شوہر مولوی محمد عثمانی سرکاری اسکولوں کے مدرّس تھے اور رٹائر ہونے کے بعد انھوں نے شہر رامپور میں رہ کر باقی عمر تصنیف و تالیف میں گزاری تھی۔ قرآن شریف کا اردو میں ''انوار القرآن'' کے عنوان سے ترجمہ کیا اور سیرت طیبہ پر ''انسان کامل'' نام سے کتاب لکھی۔ انکی دیگر کتابوں میں عقیدۂ توحید کی تشریحات پر مشتمل ''ضرب خلیل'' اور دیگر متعدد دینی مسائل پر ''کتاب و حکمت'' کے عنوان سے متعدد کتابچے قابل ذکر ہیں۔

(۲)

دادا حضور کے تیسرے بیٹے جناب سید محمود حسن مرحوم و مغفور ہمارے ابّا جان تھے۔ وہ ۳ ستمبر ۱۹۰۳ء کو بہرائچ میں پیدا ہوئے تھے اور اسم گرامی دادی امّاں کو خواب میں ملی بشارت کے مطابق دیوبند کے بزرگ عالم دین مولانا محمود حسن کے نام پر رکھا گیا تھا۔ کم عمری میں ہی قرآن پاک کے تراجم، احادیث نبوی کے کئی مجموعے، دین و فقہ کی مستند کتابیں سب ہی کچھ پڑھ ڈالا اور عربی و فارسی زبانوں پر قدرت حاصل کر لی۔ بہرائچ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے دسویں کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ گئے جہاں وہ چھ سال زیر تعلیم رہے۔ عربی زبان میں ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لے کر وطن واپس آئے اور وکالت شروع کی۔ اس میدان میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا اور جلد ہی انکا شمار قرب جوار کے چوٹی کے ماہرین قانون میں ہونے لگا۔ بہرائچ اور دیگر اضلاع کی مقامی عدالتوں کے علاوہ لکھنؤ میں واقع اودھ چیف کورٹ میں اپیلوں کی پیروی کی اور یہ سلسلہ آزادی کے بعد اس عدالت کے الٰہ آباد ہائی کورٹ کی بینچ بن جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ شہر کے محلّہ قاضی پورہ میں انھوں نے ایک بڑا پلاٹ خرید کر اس پر اپنی کوٹھی بنوائی اور اسکی پیشانی کے پتھر پر قرآن مجید کی آیت کریمہ کلّ من علیھا فان وہ یبقیٰ ربک ذو الجلال والاکرام لکھوایا۔ کوٹھی کے بیرونی حصّے میں انھوں نے اپنا آفس بنایا ہوا تھا جو قانون کی کتابوں اور مقدمات کی فائیلوں سے بھرا رہتا تھا۔ صبح کچہری جانے سے پہلے اور شام کو بعد مغرب

وہاں وکالت کے کاموں میں مصروف رہتے۔اس سے متصل وسیع ڈرائینگ روم تھا جہاں آنے جانے والوں سے ملاقات کرتے ،اورعصر اور مغرب کے درمیان روزانہ بیرونی صحن میں احباب کے ساتھ نشست ہوتی تھی۔قانون دانی کے میدان میں ن کا اس قدر شہرہ ہوا کہ کچھ حضرات نے انھیں ''وکیل بے عدیل'' کے لقب سے یاد کیا۔ عدالتوں کا کام ہندی میں ہونے لگا تو انھوں نے اپنے اسکول کے زمانے کے استاد پنڈت رام بھروسے ترپاٹھی جی کو کئی ہفتے تک بلا کر باقاعدہ ہندی سیکھی۔وکالت کے آخری دور میں وہ بہرائچ ڈسٹرکٹ بارایسوسی ایشن (ضلعی انجمن وکلاء) کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ پیشہ ورانہ زندگی میں وہ دین وشریعت کا بہت لحاظ رکھتے تھے جسکی شہادت شہر کے معروف عالم دین مولانا سلامت اللہ بیگ مرحوم نے ان الفاظ میں دی تھی ''وکالت کا پیشہ صلحاء کے نزدیک دینی اعتبار سے بے حد مجروح ہے اوراس کی محتاج بیان نہیں ہے۔مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت نے زندگی کے اس شعبے میں بھی انکی رہنمائی کی اور کردار کی بلندی، سچائی اور صفائی انکے پیشے میں بھی نمایاں رہی۔حالانکہ یہ صفات اس پیشے میں نا قابل عبور گھاٹی سمجھی جاتی ہیں لیکن مرحوم ہمیشہ صرف وہی مقدمات لیتے تھے جن میں سچائی کا عنصر غالب تر ہوتا۔حقدار کو اسکا حق مل جائے ،مظلوم کی پوری طرح دادرسی ہوہو جائے بس یہی مقصد مقدمات میں پیش نظر رہتا تھا۔ درمیان قعر دریا رہتے ہوئے بھی دامن تر ہونے سے بچایا اور ہمیشہ ہشیار باش پر مکمل طور سے عمل پیرا رہے'' (دیباچہ حیات محمود، مطبوعہ ۱۹۷۷ء، ص ۱۰)۔

آزادی کی آمد کے برسوں پہلے سے ابا جان سیاست میں دلچسپی لے رہے تھے۔پاکستان تحریک کے دوران انھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کی، آگے چل کر ضلع مسلم لیگ کے صدر بنے اور آزادی آنے پر قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں۔تقسیم وطن کے بعد پاکستان جانے والے کچھ سیاستدانوں نے انھیں وہاں اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کی مگر انھوں نے ''جو خدا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے'' کہتے ہوئے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔پھر ۱۹۵۱ میں آچاریہ کرپلانی کی کسان مزدور پرجا پارٹی جوائن کی جس نے انھیں آئندہ سال ہونے والے یوپی اسمبلی کے الکشن میں قصبہ نانپارہ سے اپنا امیدوار بنایا۔کانگریس نے انکے مقابلے کیلئے مقامی راجہ سعادت علی خاں کو میدان میں اتارا۔وہ خوب جانتے تھے کہ راجہ کے خلاف الکشن لڑنا شکست فاش کو دعوت دینا ہے مگر اس خوف سے میدان سے ہٹ جانا ان کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔بعد کے سالوں میں وہ ملّی مفاد میں کانگریس کی حمایت کرنے اور دوسروں کو بھی اسکا مشورہ دینے لگے۔۱۹۵۷ کے انتخابات سے قبل انھوں نے اس مقصد سے ''ملک کا جمہوری نظام اور آنے والے انتخابات: مسلمانان ہند کیلئے ایک لمحۂ فکریہ'' کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھ کر اپنے خرچ پر شائع کروایا تھا۔لیکن کانگریس کے صوبائی لیڈروں کے بار بار اصرار پر بھی انھوں نے پارٹی جوائن نہیں کی اور سیاست سے الگ رہ کر باقی عمر وکالت کے ساتھ دینی اور ملّی خدمات میں گزاری۔

تعلیمی معاملات میں وہ شروع ہی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔تقسیم ہند سے پہلے بہرائچ میں قائم ہونے والے مسعودیہ جناح ہائی اسکول کے قیام میں پیش پیش رہے اور اسکے مینیجر رہے۔حصول آزادی کے بعد جب آزاد کالج بنا تو اسکے معاملات میں بھی ہر طرح کی استعانت کی اور بعد میں ایک عرصے تک اس کے بھی مینیجر رہے۔اپنی مادر درسگاہ علی گڑھ کے مسائل میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔۱۹۶۶ میں وہاں ہونے والے ایک افسوسناک واقعے کے بعد جب حکومت ہند کے بنائے ہوئے ایک نئے قانون اور بعد میں عدالت عظمی کی طرف سے اسکی توثیق کے نتیجے میں یونیورسٹی کا اقلیتی کردار مجروح ہوا تو اسکی بحالی کیلئے شروع ہونے والی تحریک میں شریک ہوئے اور اس سلسلے میں کئی بار علی گڑھ اور دہلی کا سفر کیا۔صوبائی سطح پر وہ یوپی کی دینی تعلیمی کاؤنسل کے بانیوں میں تھے اور شہر بستی میں ہونے والے افتتاحی اجلاس سے انھوں نے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور قاضی عدیل عبّاسی وغیرہ کے ساتھ خطاب کیا تھا۔

دین وشریعت کے مسائل میں انھیں گہری دلچسپی تھی اور جہاں تک ممکن ہو ان پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ وقت کے ممتاز عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت کی تھی اور ان کی تصنیف تفسیر بیان القرآن کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔عربی زبان پر عبور کے باعث قرآن مجید پر ایسی زبردست گرفت حاصل کرلی تھی کہ مقامی حفاظ ان سے اپنی تلاوت صحیح کروانے کی فرمائش کرتے تھے۔بہرائچ میں ہمارے بچپن کے دوست مرحوم ساغر مہدی کے الفاظ میں ''انکے نحیف پیکر میں ایک متبحر عالم دین کا علم، ایک غیر معمولی نکتہ رس مفسر قرآن کا ذہن، فارسی اور اردو شعر وادب کے اسکالر کی بصیرت، تہذیب وثقافت کے پروقار امین کا مزاج، مرد مومن کی شان، اظہار حق کی جرأت اور کردار کی قوت کا حسین امتزاج تھا'' (حیات محمود، ص ۲۰۸)۔ علماء دین سے انھیں ہمیشہ ایک دلی تعلّق رہا اور طبقاتی یا سیاسی اختلاف

اس پر کبھی غالب نہیں آیا۔شہر کے نامور علماء جن میں محفوظ الرحمٰن نامی اور سلامت اللہ بیگ صاحبان شامل تھے انکے حلقۂ احباب میں تھے۔باہر سے آنے والے علماء کی وہ ہمیشہ میزبانی کرتے تھے۔گھر میں جن علماء کرام کو ہم نے بچپن میں مہمان دیکھا تھا ان میں مولانا مناظر احسن گیلانی، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قاری محمد طیب، شاہ معین الدین احمد ندوی، آزاد سبحانی اور شاہد فاخری وغیرہ رحم اللہ اجمعین کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ سے انھیں بہت عقیدت تھی اور رائے بریلی کے قریب تکیہ میں انکی مجلسوں میں شریک ہونے جایا کرتے تھے۔علماء کے طبقے میں انکا بے حد احترام تھا اور ''سیّد صاحب'' کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ شہر میں ان کے دیگر احباب کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا اور اس میں زندگی کے ہر شعبے کے لوگ شامل تھے۔وکلاء کے طبقے میں پنڈت اونکار ناتھ کول، سید ہدایت حسین زیدی اور بابو مہراج نرائن وغیرہ سے خاص ربط تھا۔انکے علاوہ قاضی نثار الحق، جناب اظہر نعمانی ردولوی، عبداللہ میاں پارچہ فروش، مرزا انور بیگ اور حافظ نعمان بیگ صاحبان انکے خاص الخاص مصاحبین میں تھے۔

ابّا جان نے عمر کے ہر دور میں زندگی بڑے منظم طریقے سے گزاری اور شب و روز کے معمول میں کبھی فرق نہیں کیا۔انکے ملازم خاص محمد اسلم خاں صاحب (متوفی ۲۰۱۳ء) نے جو دس برس کی عمر سے انکے ساتھ تھے انکی بڑی خدمت کی۔نہ صرف حالت صحت میں بلکہ بیماری میں بھی انھیں کبھی طلوع آفتاب کے وقت سوتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔غذا ہمیشہ قلیل رہی، جسامت موزوں، اعضاء متناسب اور چہرے سے ٹپکتی ہوئی وجاہت۔عدالت اور عوامی جلسوں میں وہ ہمیشہ شیروانی پہنتے اور گھر میں سفید کرتا پائجامہ۔صبح کی ہوا خوری میں کوٹ پتلون پہنتے تھے جسکے لئے وہ پابندی سے شہر کے ایک کنارے پر واقع جھینگا گھاٹ جایا کرتے تھے۔فجر، مغرب اور عشاء کی نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرنے کا معمول زندگی بھر نبھایا، رمضان کے روزے کبھی قضا نہیں کئے اور جون جولائی کی شدید گرمی میں بھی ترک نہیں کئے۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا اور شہر میں ہونے والے مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے۔بہت خوش الحان تھے اور کبھی کبھی گھر کے اندر فارسی اساتذہ کا کلام گنگنایا کرتے تھے جن میں عبدالرحمٰن جامی کی نعت ''نسیما جانب بطحا گزر کن، زاحوالم محمد را خبر کن'' انکی سب سے پسندیدہ چیز تھی۔علاّمہ اقبال کی منقبت برائے جگر گوشۂ رسولؐ بی بی فاطمہ زہرا ''مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز، از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز'' مترنم آواز میں اکثر گنگناتے تھے۔رات میں گھر کے اندرونی صحن میں اکثر بیت بازی کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔گھر میں ریڈیو تھا جس پر صرف مذہبی پروگرام، خبریں اور شعر شاعری سننے کی اجازت تھی، فلمی نغمے شجر ممنوعہ کے درجے میں تھے۔

اپنے عقائد میں ابّا جان توحید خالص کے قائل اور اس پر سختی سے عمل پیرا تھے۔اس عقیدے کی دوسروں کو فہمائش نہ صرف بھرپور کرتے تھے بلکہ اس کی خاطر اپنے پرائے کسی سے بھی خفا بلکہ متنفر ہو جانے میں بھی انھیں کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔عوام سے الطاف حسین حالی کی شکایت ''نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھایں، اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھایں'' کی بیخ کنی کیلئے ہر کس و ناکس کے ساتھ شمشیر بزن ہوتے رہتے تھے، بدعقیدگی اور گنڈے تعویذ کے سخت خلاف تھے۔ایک دفعہ ضلعی عدالت نے انھیں بہرائچ کی مشہور و معروف درگاہ سید سالار مسعود غازی سے متعلق ایک مقدمے میں وہاں کا ناظم مالیات مقرّر کیا تھا۔درگاہ میں بعض زائرین جوش عقیدت میں مزار پر سجدہ کرتے تھے جس پر انھوں نے پابندی لگائی تو قبر پرست حضرات عدالت عالیہ میں اپیل لے کر پہونچے۔آزادی مذہب کے نام پر فیصلہ اپیل کنندگان کے حق میں ہوا تو انھوں نے مستعفی ہونے کو ترجیح دی۔اسکے برسوں بعد ۱۹۵۹ء میں درگاہ کے معاملات پر پھر نزاع ہوا تو یوپی سنٹرل بورڈ کے صدر جسٹس نعمت اللہ مرحوم نے انھیں انھیں درگاہ کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر کا عہدہ سونپا، مگر وہاں ہونے والی بدعتی رسوم اور انکے ذاتی عقائد کے تضاد نے انھیں اس عہدے پر زیادہ عرصے نہیں رہنے دیا۔

ایک عرصے سے انھیں فریضۂ حج کی ادائیگی کی فکر رہتی تھی مگر وکالت میں ہر ممکن احتیاط کرنے کے باوجود اس پیشے کے دینی حلقوں کی نظر میں مجروح ہونے کے سبب تذبذب میں رہتے تھے جبکہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ تھا نہیں، نہ کوئی موروثی زمین جائداد تھی نہ زراعت۔۱۹۶۸ء میں پینسٹھ سال کی عمر ہوتے ہوتے اس فکر اور تذبذب دونوں میں اضافہ ہونے لگا۔مصلحت خداوندی نے انکی سفر حج کی شدید خواہش کی تکمیل کا غیب سے یوں اہتمام فرمایا کہ ۱۹۷۴ء میں ہمارے دو چھوٹے بھائیوں کو سلطنت عمان کے صدر مقام مسقط میں ملازمتیں مل گئیں اور انکے زیر اہتمام آئندہ سال کے حج میں انکی شرکت کی تیاریاں ہونے لگیں۔وسط ستمبر ۱۹۷۵ء میں وہ مسقط تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد سفر حج پر روانہ ہوئے۔انکی صحت بہت خراب ہو چکی تھی اور جسم بہت نحیف و نزار ہو چکا تھا مگر قوّت ارادی سلامت تھی۔

انھیں نہ صرف اندازہ تھا کہ وہاں سے واپسی محال ہوسکتی ہے بلکہ خواہش بھی تھی کہ ایسا ہی ہو اور ان دنوں مولانا محمّد علی جوہر کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ''وہ اور ہوں گے جن کو ہے یہ زندگی عزیز، ہم موت ڈھونڈتے ہیں دیارِ حبیب میں''۔ وسط دسمبر میں وہ ارکان حج سے فارغ ہوئے۔ میدان مزدلفہ میں کھلے آسمان کے نیچے بہ حالت احرام شب گزاری نے انھیں نمونیا کے عارضے میں مبتلا کر دیا اس لئے واپس آکر مکہ معظّمہ میں فروکش رہے۔ ابھی مدینہ منورہ روانگی کا دن نہیں آیا تھا کہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۵ کو بعد نماز فجر وہ خدا کے زمینی گھر سے اسکے آسمانی گھر کی طرف چپ چاپ روانہ ہوگئے۔ حرم شریف میں نماز جنازہ ہوئی اور مکہ معظّمہ کے قدیم تاریخی قبرستان جنّت المعلیٰ میں امّ المومنین بی بی خدیجہ کے مزار کے قریب سپرد خاک کر دیئے گئے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔ انکی وفات کے بعد ہم نے انکے حالات زندگی اور عقائد و نظریات پر ''حیات محمود'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی اور اس کے کئی سو نسخے اپنے ذاتی اخراجات سے طبع کروا کے اعزّاء و احباب کو تحفتاً ارسال کئے۔ خود انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایّام میں اردو میں فن تجوید پر ''قرآن کریم کی بیسک ریڈر'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۹۸۲ میں لکھنؤ کے مکتبہ الفرقان سے شائع ہوئی تھی۔ بعد کے سالوں میں یہ کتاب اردو اور ہندی رسم الخط میں بار بار طبع ہوئی اور ۲۰۰۱ میں اسکا ہمارا تیار کردہ انگریزی ترجمہ دہلی میں شائع ہوا۔

(۳)

ہمارے ننھیالی اجداد کا آبائی تعلّق مغربی یوپی کے ضلع سہارنپور سے تھا۔ اس ضلع کا امبیٹہ نامی ایک قصبہ معروف بزرگ حضرت شاہ ابوالمعالی علیہ الرحمۃ کا مدفن ہونے کے باعث صدیوں سے بہ نظر عقیدت و احترام دیکھا جاتا رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں وہاں ایک بزرگ سیّد فضل عظیم نامی رہتے تھے جن کا شمار اس خطّے کے مشاہیر میں ہوتا تھا۔ ان کی متعدّد اولادوں میں سے سیّد مقبول عظیم اور سید احسان عظیم مرحومین کے نام معروف ہیں۔ سید مقبول عظیم کے دو بیٹوں تنقید نگار سید وقار عظیم اور معروف سخنور سید اقبال عظیم نے برّصغیر کی دنیائے ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ سیّد احسان عظیم مرحوم و مغفور ہمارے نانا ابّا تھے۔ انھوں نے حکومت یوپی کے پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف ڈپارٹمنٹ میں ملازمت شروع کی تھی۔ بتدریج ترقی کر کے پورے صوبے کے ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل کے اعلیٰ عہدے تک پہونچے اور برطانوی حکومت کی طرف سے ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازے گئے۔ ملازمت سے سبکدوشی سے کئی سال پہلے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور شہر کی مشہور شاہراہ ہیویٹ روڈ پر واقع لال کوٹھی میں رہتے تھے۔ انھیں خدا نے تین بیٹیاں (نایاب جہاں بیگم، سردار جہاں، منور جہاں) اور پانچ بیٹے (سید سراج العظیم، اقبال عظیم، فیروز عظیم، شید اعظیم، سعید العظیم) عطا کئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بیحد دگرگوں حالات پیدا ہوئے تو ان سے دلبرداشتہ ہوکر وہ اپنے سب بیٹوں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۶۰ میں کراچی میں انتقال فرمایا جسکے دس سال بعد ہمیں انکی آخری آرامگاہ پر حاضری کا موقع ملا تھا۔ نانی صاحبہ مرادآباد کے معروف خاندان مفتیان سے تعلّق رکھتی تھیں اور تقسیم ملک سے پہلے ۱۹۴۳ میں وفات پاکر لکھنؤ کے مشہور عیش باغ قبرستان میں مدفون ہوئی تھیں جہاں انکی آخری آرامگاہ پر یہ شعر کندہ ہے ''بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی، کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے''۔ نانا ابّا کی اولاد میں سے دو (نایاب جہاں، اقبال عظیم) بھی آزادی سے پہلے واصل بحق ہو چکے تھے اور وہ بھی وہیں مدفون ہیں۔ اول الذکر کے دونوں بیٹے سید اسرار احمد اور سید احتشام احمد پہلے پاکستان اور پھر وہاں سے ہجرت کر کے امریکہ چلے گئے تھے۔ سید احتشام احمد ریڈیو امریکہ میں ملازمت کرتے تھے اور سبکدوشی کے بعد واشنگٹن میں رہتے ہیں جہاں ہماری ان سے کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔ نانا ابّا کی منجھلی بیٹی سردار جہاں بیگم عرف چھوٹی بی لکھنؤ میں اپنے شوہر سید عباد حسین مرحوم کے ساتھ پہلے نخّاس اور بعد میں لاٹوش روڈ پر رہتی تھیں۔ انکی پانچ اولادوں (سید رشاد حسین، نوشاد، شاہد، زاہد، خورشید) میں سے اب صرف سید خورشید حسین حیات ہیں اور بمبئی میں مقیم ہیں۔

ہمارے ماموں صاحبان میں سے دو سید شید اعظیم اور سیّد سعید العظیم ہماری والدہ سے چھوٹے تھے اور بالترتیب دولہا جان اور عزیز جان کہلاتے تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے دونوں اکثر و بیشتر بہرائچ جایا کرتے تھے اور اسکے بعد صرف ایک بار ۱۹۶۳ میں ہماری ہمشیرہ کی شادی میں شرکت کیلئے ہندوستان آئے تھے۔ شید اعظیم صاحب تقسیم ہند سے پہلے جونا گڑھ میں پروفیسر تھے۔ پاکستان میں وہ مختلف شہروں کے کالجوں میں پروفیسر رہے اور آخر میں شہر پٹارو کے ملٹری کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے رٹائر ہوئے۔ طویل عمر پائی اور تقریباً ۹۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ سعید العظیم صاحب جو حکومت پاکستان کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ان سے کئی سال پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ دونوں حضرات کراچی میں علاقہ گلشن اقبال کی مختلف کالونیوں میں رہائش پذیر تھے اور ہمیں کئی بار انکی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تھا۔

(۴)

نانا ابا کی سب سے چھوٹی بیٹی منور جہاں عرف منّی بی ہماری والدہ تھیں جنھیں ہم بی امی کہتے تھے۔ ۱۹۱۴ میں جھانسی میں پیدا ہوئی تھیں اور بیس سال کی عمر میں ابا جان کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئی تھیں۔ کافی تعلیمیافتہ تھیں، اردو، فارسی اور انگریزی جانتی تھیں اور ایک بہت خوب رو، خوبصورت، خوب سیرت، سنجیدہ اور متین شخصیت کی حامل تھیں۔ نانی صاحبہ کے ایک بھائی مفتی محمد عطا مرحوم ومغفور ضلع بہرائچ کے قصبہ نانپارہ میں سرکاری ملازمت میں تھے اور ہمارے والدین کا رشتہ انھیں نے یہ کہہ کے طے کروایا تھا کہ ''میں نے منّی بی کیلئے ایسا رشتہ ڈھونڈا ہے کہ چراغ تو کیا گیس کا ہنڈا لے کر ڈھونڈا جائے تب بھی نہیں ملے گا''۔ اگست ۱۹۳۴ کو لکھنؤ کے مشہور عالم دین مولانا عبدالشکور نے نکاح پڑھایا تھا۔ ازدواجی رفاقت کے تقریباً انتیس سال بہ حسن وخوبی گزرے۔ اپنے شوہر محترم کے عندیے کے مطابق زندگی بھر پردے میں رہیں اور اپنے خسر کے علاوہ کسی اور سسرالی عزیز کے سامنے بھی نہیں آئیں۔ اپنے والد بزرگوار اور سب بھائیوں کے پاکستان چلے جانے کے بعد سے وہ اکثر بہت اداس ہو جایا کرتی تھیں۔ جون ۱۹۵۳ کی ۸ تاریخ کو جبکہ رمضان المبارک کا پچیسواں روزہ تھا اور گھر میں عیدالفطر کی تیاریاں چل رہی تھیں اچانک شدید بیمار پڑ گئیں۔ سارے شہر میں جتنی طبّی سہولیات مل سکتی تھیں سب مہیّا کروائی گئیں لیکن مشیّت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سب دوائیں اور دعائیں بیکار گئیں اور تیسرے دن شام کے پونے پانچ بجے زندگی کے انتالیسویں سال میں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ہم اس وقت نویں کلاس کے طالبعلم تھے اور والد محترم کے حکم سے انکے سرہانے بیٹھے سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے۔ ہماری کمسنی اور طفلانہ معصومیت کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ دزدیدہ نظروں سے انکی سانس اکھڑتے اور پھر سر ایک طرف لڑھکتے دیکھ کر بھی ہم نے تلاوت بند نہیں کی حتیٰ کہ ابا جان نے ہمارے ہاتھوں میں کلام پاک یہ کہتے ہوئے بند کر دیا کہ ''آپ کی بی امّی چلی گئیں''۔

ابا جان نے جس بہادری اور صبر واستقامت سے اس اچانک ہونے والے حادثۂ جانکاہ کا سامنا کیا اسکی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ روزے سے تھے لیکن سخت پیاس کے باوجود افطار کے وقت کا انتظار کیا اور پانی سے روزہ کھول کے اعلان کیا کہ تدفین اسی شب میں کی جائے گی۔ گھر کے باہری صحن میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں جن میں متعدد علماء بھی شامل تھے دنیا سے جانے والی رفیقۂ حیات کی نماز جنازہ انھوں نے خود پڑھائی اور نصف شب کو جنازہ ایک ہجوم کے ساتھ قبرستان پہونچا۔ والد صاحب کے حکم سے چاروں طرف چادر تان کے ہمیں کفن سرکا کے انکا آخری دیدار کرایا گیا اور دادا حضور کی قبر کے برابر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ہمارے لئے انکی مادرانہ شفقت کی کوئی تھاہ نہیں تھی اور علم وادب کے میدانوں میں ہماری طفلانہ دلچسپی دیکھ کر انھوں نے ہماری قدم قدم پر ہمّت افزائی کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سے ملی ہوئی ابتدائی تربیت ہی نے ہماری آئندہ پوری زندگی کے نقوش مرتب کئے۔ کم عمری میں انھیں مختصر سی علالت کے بعد شدید جسمانی اور دماغی تکلیف کی حالت میں جاں بحق ہوتے دیکھنے اور چند گھنٹوں بعد ہی ہماری آنکھوں کے سامنے زمین کی تہوں میں گم کر دیئے جانے کے جانگداز واقعات نے ہمارے دل ودماغ پر ایسا منفی اثر ڈالا تھا جو ناقابل بیان ہے اور جس نے ہمیں ساری زندگی بے چین رکھا ہے۔

******